اسلامی معیشت کے دو بنیادی خصوصیات

''طلب ورسد کی آزادی کا تحفظ اور مبہم وغیر یقینی سودوں کی ممانعت'' کا فقہی وتحقیقی جائزہ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ

﴿1﴾ طلب ورسد کی آزادی کا تحفظ

دُنیا کے قدرتی نظام پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہاں ہر شخص، ہر شعبۂ زندگی میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے کی امداد کا محتاج ہے، اور سب انسان اسی باہمی احتیاج کے رشتے میں بندھے ہوئے، ایک دوسرے کی، اور پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کررہے ہیں، مرد عورت کا محتاج ہے، عورت مرد کی، ماں باپ اولاد کے محتاج ہیں، اولاد ماں باپ کی، اُستاد شاگرد کا محتاج ہے، شاگرد اُستاد کا، تاجر گاہک کا محتاج ہے، گاہک تاجر کا، صنعتکار مزدور کا محتاج ہے، مزدور صنعتکار کا، زمیندار کاشتکار (ہاری) کا محتاج ہے اور کاشتکار زمیندار کا۔

باہمی اِحتیاج کے اس قدرتی نظام کو معیشت کے حوالے سے، موجودہ اِصطلاح میں ''طلب ورسد کا نظام'' (Law of Demand and Supply) کہا جاتا ہے۔ ''طلب ورسد'' کا قدرتی نظام یہ ہے کہ جس چیز کی ''رسد'' (دستیابی یا فراہمی) کم ہو، اور ''طلب'' (مانگ) زیادہ تو اس چیز کی قیمت قدرتی طور پر بڑھ جاتی ہے، لہٰذا صنعتکار اور تاجر اس چیز میں زیادہ نفع دیکھ کر اپنا سرمایہ اور وسائل اس کی تیاری اور فراہمی میں لگانے لگتے ہیں، اور جب ''طلب'' کے مقابلے میں ''رسد'' بڑھ جائے، یعنی وہ چیز بازار میں فراوانی کے ساتھ پائی جانے لگے اور گاہک اتنے نہ ہوں، تو اس کی قیمت قدرتی طور پر گھٹ جاتی ہے، چنانچہ اس کی مزید تیاری نفع بخش نہیں رہتی، اور وسائلِ پیداوار کا زائد حصہ اس کے بجائے دوسرے ایسے کاموں میں مصروف ہونے لگتا ہے جن کی ضرورت معاشرے کو زیادہ ہو۔ اس طرح تاجر اور صنعتکار بہتر نفع حاصل کرنے کے لئے قدرتی طور پر معاشرے کی ضروریات فراہم کرتے ہیں، اور ساتھ ہی قیمتوں میں توازن برقرار رہنے کا عمل خود بخود جاری رہتا ہے۔

''طلب ورسد'' کا یہ قدرتی نظام جس طرح اشیائے صَرف اور مصنوعات میں کارفرما ہے، اسی طرح صنعتی تعلقات میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ تاجروں صنعتکاروں اور زمینداروں کو مزدوروں اور کارکنوں کی ''طلب'' ہوتی ہے جن کے بغیر نہ تجارت وصنعت کا پہیہ چل سکتا ہے نہ زراعت وباغبانی اپنے برگ وبار لاسکتی ہے۔ ادھر مزدوروں اور کارکنوں کو روزگار کی ''طلب'' ہوتی ہے، باہمی احتیاج کے اس قدرتی نظام کے تحت دونوں فریق ایک دوسرے کے لئے ''رسد'' بن کر ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ جہاں اِفرادی قوت (کارکن) کم اور وسائلِ روزگار زیادہ ہوں وہاں تنخواہیں اور اُجرتیں زیادہ ہوتی ہیں، اور جہاں معاملہ برعکس

ہو کہ اَفرادی قوت زیادہ اور وسائل روزگار کم ہوں تو تنخواہیں اور اُجرتیں کم ہوتی ہیں۔

یہاں بھی کارکنوں کی اُجرت اور آجر (Enterpreneur) کے منافع میں توازن ''طلب ورسد'' ہی کا قدرتی نظام قائم رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ مصنوعی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو، یعنی ہر شخص اس بات کا فیصلہ خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض اور ذمہ داریاں میں نے اپنے ذمہ لی ہیں ان کا کتنا معاوضہ میرے لئے کافی ہے، اس سے کم ملے تو یہ کام کرنے پر راضی نہ ہو، اور زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا اس سے کام نہ لے، ہر شخص اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق ہے۔

یوں ''طلب ورسد'' کے اس قدرتی نظام کو اگر آزاد رکھا جائے تو اس کے تحت معاشرے کی ضروریات باآسانی پوری ہونے کے علاوہ مستأجر (آجر) کے منافع، کارکنوں کی اُجرت، اور اشیائے صَرف کی قیمتوں میں ایک ہمہ گیر قدرتی توازن قائم رہتا ہے جس کے بغیر ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر کا خواب دیکھا تو جاسکتا ہے شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

قرآنِ حکیم نے اس قدرتی نظام کی طرف یہ فرما کر توجہ دلائی ہے کہ:

نَحْنُ قَسَمْنَابَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِالدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضاً سُخْرِيًا

''دنیاوی زندگی میں ہم ہی نے ان کے درمیان اُن کی معیشت کو تقسیم کر رکھا ہے، اور ہم نے ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔'' (سورۃ الزخرف:۳۲)

اس آیت نے یہ حقیقت کھول کر بتادی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ذرائع معاش کی تقسیم کا کام نہ تو (سوشلزم کی طرح) حکومت اور افسر شاہی کے حوالے کیا ہے نہ (جاگیرداری وسرمایہ داری نظام کی طرح) چند اَفراد اور خاندانوں کے رحم وکرم پر چھوڑا ہے، بلکہ اپنی حکمتِ بالغہ سے دُنیا کا نظام ہی ایسا بنادیا ہے کہ اگر حکومت یا بااثر طبقات کی طرف سے (اِرتکازِ دولت کے بل بوتے پر اور اپنی اِجارہ داریاں قائم کرکے) مصنوعی رُکاوٹیں کھڑی نہ کی جائیں تو ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسروں کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کے وہ مستحق ہیں۔ اور ہر شخص کے دِل میں وہی کام ڈال دیا ہے جو اس کے لئے زیادہ مناسب ہے، اور جسے وہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے، چنانچہ ہر شخص، خواہ وہ ایک خاکروب ہی کیوں نہ ہو، اپنے کام میں مگن ہے اور اسی میں کمال پیدا کرنے کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھتا ہے۔

اسلام نے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کا کام ''طلب ورسد'' کی انہی فطری قوتوں سے لیا ہے، اور عام حالات میں اسے کسی انسانی اِدارے یا گروہ کے حوالے نہیں کیا تاکہ ''طلب ورسد'' کی آزادی برقرار رہے، اور صنعت وتجارت اور بازار اپنی طبعی رفتار سے آزادانہ طور پر ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر میں بھرپور کردار ادا کرتے رہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آجر (Entrepreneur) کے منافع، کارکنوں کی اُجرت، اور اشیائے صَرف کی قیمتوں میں توازن رکھنے اور معیشت کو عام خوشحالی کی طرف گامزن کرنے کے لئے ''طلب ورسد'' کے قدرتی نظام کو ان رُکاوٹوں اور حیلوں

سے بچانا ضروری ہے جو اس کی آزادی میں خلل انداز ہوتے ہوں، چنانچہ اسلام کی معاشی تعلیمات نے ایک طرف تو اِرتکازِ دولت ہی پر ضربِ کاری لگائی ہے، جو طلب و رسد کی آزادی کا گلا گھونٹنے کا بنیادی سبب ہے، دوسری طرف ان فطری قوتوں کی حوصلہ افزائی اور تحفظ کے لئے ہر اس چور دروازے کو بند کر دیا ہے جس سے عوام کی اس آزادی پر شب خون مارا جا سکے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ''اِحتکار'' (ذخیرہ اندوزی) کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

۔''من احتکر فھو خاطی ء''

''جو شخص ذخیرہ اندوزی کرے وہ خطا کار ہے۔''

نیز آپ ﷺ کا اِرشاد ہے کہ:

''من احتکر علی المسلمین طعاماً ضربہ اللّٰہ بالجذام و الا فلاس.''

''جو شخص کھانے کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کر کے مسلمانوں کو تکلیف میں ڈالے گا، اللہ اُس پر جذام (کوڑھ پن) اور اِفلاس کو مسلط کر دے گا۔''

اس حدیث میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے کی سزا جذام اور اِفلاس بتائی گئی ہے، کیونکہ وہ مخلوقِ خدا کی غذائی رسد میں رُکاوٹ ڈال کر انہیں تکلیف میں مبتلا کرتا ہے، (یہ اور بات ہے کہ اس کی کسی نیکی کے باعث اللہ تعالیٰ یہ سزا اس سے روک دے یا اُسے ڈھیل دینے اور سخت ترین سزا دینے کے لئے سزا کو آخرت تک مؤخر کر دے۔) اسلامی حکومت جو سزا دے گی وہ اس کے علاوہ ہے۔

(۲) آڑھت کی ممانعت

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

''لا یبع حاضر لباذ، دعو الناس یرزق اللّٰہ بعضھم من بعض.''

''کسی دیہاتی کا مالِ تجارت فروخت کرنے کے لئے کوئی شہری اس کا وکیل (ایجنٹ) نہ بنے، لوگوں کو آزاد چھوڑو، تاکہ اللہ ایک دوسرے سے رزق پہنچائے۔''

اس ممانعت کی علت (یا حکمت) کی طرف خود اسی حدیث کے آخری جملے میں اِشارہ فرما دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خریدار کو رِزق تاجر سے دِلواتا ہے اور تاجر کو خریدار سے، بیچ کے کسی شخص (Middle Man) کو اس خدائی نظام میں مداخلت اور رُکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں، اگرچہ وہ اس تاجر کا بھائی یا باپ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ باہر کا آدمی مال شہر میں لا کر خود فروخت کرے گا تو بلا تاخیر بیچ کر فارغ ہونا چاہے گا، اور اپنا مناسب نفع رکھ کر بھی سستا بیچے گا، اور شہر کا آدمی (آڑھتی) بیچ میں آجائے گا تو روک روک کر مہنگا فروخت کرے گا، جس سے شہریوں کی ''رسد'' میں رُکاوٹ پیدا ہو گی اور مہنگائی بڑھے گی، چنانچہ جمہور فقہاء اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق

ہے کہ آڑھت کا ایسا کاروبار نا جائز ہے جو شہریوں کے لئے ضرر اور مہنگائی کا باعث ہو۔

(۳) جھوٹی "طلب" ظاہر کرنے (نَجش) کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

۔"لا تنا حبشوا" یعنی تم "نجش" نہ کرنا۔

"نجش" اور "تناجش" کی حقیقت یہ ہے کہ جب کسی چیز کا سودا ہو رہا ہو کوئی تیسرا شخص جو سودا کرنے کا حقیقت میں اِرادہ نہیں رکھتا خریدار کو محض دھوکا دینے (جھوٹی مانگ ظاہر کرنے) کے لئے اس چیز کی زیادہ قیمت لگا دے تا کہ اصل خریدار اس بھی زیادہ قیمت پر اسے خرید لے۔ جیسا کہ بعض نیلام کرنے والے اپنے کچھ آدمی جھوٹی بولی لگانے کے لئے مقرر کر دیتے ہیں، یہ عمل (بالاجماع) حرام ہے۔ اور یہ بھی "رسد" میں رُکاوٹ ڈالنے یعنی اُسے مہنگا کرنے کی ایک صورت ہے۔

(۴) سودے پر سودے (سوم علی سوم اخیہ) کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"لَا یَسُم الْمُسْلِمُ عَلٰی سَوْمِ اَخِیْہِ"

"کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے سودے پر سودا نہ کرے۔"

یعنی جب دو آدمیوں کے درمیان خرید و فروخت یا کرایہ داری یا ملازمت و مزدوری کا سودا طے پا رہا ہو، معاوضے پر باہمی رضامندی بھی ہو گئی ہو، مگر ابھی سودا نہیں ہوا، اس حالت میں کوئی تیسرا شخص زیادہ معاوضہ دے کر وہ سودا نہ کرے، یہ عمل بھی بالاتفاق ناجائز ہے، کیونکہ اس سے دونوں گاہکوں کے درمیان عداوت جنم لیتی ہے اور پہلے گاہک کو جو چیز (رسد) مل رہی تھی اس میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

(۴) "تلقی الجلب" (باہر سے آنے والے مالِ تجارت کو شہر میں پہنچنے سے پہلے خریدنے) کی ممانعت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی ان تتلقی السلع حتّٰی تبلغ الأسواق."

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (شہر کے لئے) باہر سے آنے والے مالِ تجارت کو بازاروں میں پہنچنے سے پہلے خریدنے کی ممانعت فرمائی ہے۔"

اس ممانعت کا بھی ایک اہم مقصد یہ ہے کہ شہر کے لئے باہر سے آنے والے مالِ تجارت (رسد) کو بعض تاجر بازار میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید کر اس پر اپنی اِجارہ داری (Monopoly) قائم نہ کر لیں، اور لوگوں سے من مانی قیمت وصول نہ کر سکیں، کیونکہ مال اگر بازار میں آ کر کھلے عام فروخت ہو گا تو چھوٹے بڑے بہت سے تاجر اِسے خریدیں گے، اور آپس کی مسابقت (کمپیٹیشن) کے نتیجے میں

کوئی بھی تاجر اس کی قیمت من مانے طریقے پر نہیں بڑھا سکے گا۔

(۶)"بیعُ المبیع قبل القبض "(Sale Before Acquiring Possession) خریدی ہوئی چیز کو وصول کرنے سے پہلے آگے فروخت کرنے) کی ممانعت

یہ طریقۂ تجارت آج کل بہت رائج ہے اور سٹہ (Speculation) میں داخل ہے کہ ایک چیز کا آرڈر کسی تاجر نے دوسرے (مقامی یا بیرون ملک تاجر) کو دیا، اس چیز کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس پر بیسیوں سودے ہو جاتے ہیں، جس تاجر نے مال کا آرڈر دیا، وہ اس مال کی وہاں سے روانگی سے پہلے ہی اسے نفع لے کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، دوسرا تیسرے کے ہاتھ، اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ، اس طرح ہر خریدنے والا اس غائب مال پر نفع لے کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کرتا رہتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام صارفین تک پہنچتے پہنچتے اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ کر کئی گنا ہو جاتی ہے، جو نفع بیچ کے سٹہ باز لے اُڑتے ہیں، وہ سارا کا سارا صارفین کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اسلام نے اس بظاہر "شریفانہ" لوٹ مار کا راستہ روکنے کے لئے یہ قانون بنا دیا کہ خریدی ہوئی چیز کو جب تک خریدار اپنے قبضے میں نہ لے لے وہ اسے آگے فروخت نہیں کر سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"مَنِ ابْتَاعَ طَعَاماً فَلاَ يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَه ."

"جس نے کوئی کھانے کی چیز خریدی وہ اسے وصول کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے۔"

یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یہ روایت کی ہے کہ:

"فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ حَتّٰى يَحُوْزَهَا التُّجَّارُ اِلٰى رِحَالِهِمْ".

"سامانِ تجارت جہاں خریدا جائے وہیں اُسے آگے فروخت کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ تاجر اُسے اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچا دیں (پھر آگے فروخت کر سکتے ہیں)۔" اس مضمون کی اور بھی کئی احادیث قابلِ اعتماد سندوں کے ساتھ ثابت ہیں۔ اور شریعت کے اس قانون پر اُمت کا اجماع ہے۔ البتہ اس کی فقہی تفصیلات میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

یہ چند مثالیں یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام نے "طلب و رسد" (Demand and Supply) کو آزاد رکھنے کا اہتمام کیسی نکتہ رسی سے کیا ہے، اور اُس میں اَدنیٰ رُکاوٹ کو اور مصنوعی مہنگائی کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو بند کرنے کے لئے کیسے حکیمانہ اُصول مقرر کئے ہیں، حتیٰ کہ اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری کنٹرول کو بھی پسند نہیں کیا گیا، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ سے درخواست کی گئی کہ آپ بازار میں فروخت ہونے والی چیزوں کی قیمتیں سرکاری طور پر مقرر فرما دیں تو آپ نے فرمایا کہ:

"اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ"

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی قیمتیں مقرر کرنے والا، وہی کمی کرنے والا، وہی بڑھانے والا، وہی رازق ہے۔"

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلب ورسد کے فطری اُصول مقرر فرمادیئے ہیں جن سے قیمتیں فطری طور پر متعین ہوتی رہتی ہیں، اس فطری نظام کو چھوڑ کر مصنوعی طور سے قیمتیں متعین کرنا پسندیدہ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ دِین ومذہب سے مادر پدر آزاد نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) میں آزادی صرف خودغرض سرمایہ داروں کے حصے میں آتی ہے، طلب ورسد (Demand and Supply) کی فطری قوتیں، اور معیشت وتجارت اور بازاران کے محکوم ہوتے ہیں، غریب طبقے کے حصے میں محرومیوں کے سوا کچھ نہیں آتا، اس کے برخلاف اسلام کے معاشی نظام میں معیشت اور تجارت وبازار (چند دِینی، اَخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کے ساتھ) آزاد ہوتے ہیں، اور سرمایہ داروں پر صرف ایسی پابندیاں ہوتی ہیں کہ وہ محض نفع اندوزی کے لئے اپنا سرمایہ ملک اور عوام کے مجموعی مفادات کے خلاف اور لوگوں کی دینی اور اخلاقی اقدار کے خلاف استعمال نہ کرسکیں، بازار اور وسائلِ معاش کی آزادی کو سلب نہ کرسکیں، اور طلب ورسد کی فطری قوتوں کو مصنوعی طور پر اپنے کنٹرول میں لاکر عوام پر رِزق کے دروازے تنگ نہ کرسکیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی دولت کا ذخیرہ چند خاندانوں میں سمٹنے کے بجائے پورے معاشرے میں رواں دواں رہتا ہے، وسائلِ معاش کی فراوانی ہوتی ہے، ہر انسان اپنی صلاحیت، محنت یا سرمایہ کے تناسب سے حلال کمائی کے مناسب مواقع حاصل کرسکتا ہے، ایک متوازن معیشت اور خوشحال معاشرہ وجود میں آتا ہے، اور ایک غریب انسان بچوں کا پیٹ پالنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی غلامی پر مجبور نہیں ہوتا۔

ا۔ جو مال "ضمان" (Risk) میں نہیں اُس سے نفع کمانا جائز نہیں

اسلامی معیشت کی ایک خصوصیت جو ایک فقہی قاعدے کی حیثیت رکھتی ہے، اور آنحضرت ﷺ کی احادیث نے عطا کی ہے، یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی کسی چیز سے نفع کمانے کا حق صرف اسی صورت میں ہے جبکہ اُس چیز کے نقصان کا خطرہ (Risk) بھی اُس کے ذمہ ہو، یعنی یہ جائز نہیں کہ آدمی اپنی چیز کا نفع تو خود اُٹھائے، اور اگر وہ چیز ضائع ہوجائے تو اس کا نقصان کسی اور شخص پر ڈال دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ آدمی اپنی جس چیز کا نفع اُٹھائے گا اُس کا نقصان کا کے ضامن اور ذمہ دار خود وہی ہوگا، کسی اور پر اُس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

یہ انصاف پر مبنی ایک بڑا حکیمانہ اُصول اور قاعدۂ کلیہ ہے، جسے شرعی اِصطلاح میں "اَلْخَرَاجُ بِالضمان" بھی کہا جاتا ہے، اور "اَلْغُنْمُ بِالْغُرْمِ" بھی، اس کا اثر تجارت ومعیشت کے بہت سارے مسائل پر پڑتا ہے، اور یہ اشیائے ضرورت کی مہنگائی بڑھانے کے ایک چور دروازے کو بھی بند کرتا ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ چونکہ نظامِ سرمایہ داری اس اُصول کا پابند نہیں، اس لئے دوسرے بہت سے مسائل کی طرح وہ ان مسائل میں بھی اسلامی تعلیمات سے متصادم نظر آتا ہے، اور اپنے مزاج کے مطابق غریب عوام کی معاشی

مشکلات میں اِضافے کا باعث بنتا ہے۔

ممانعت کی احادیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اَلْخَرَاجُ بِالضمان"

"نفع کا اِستحقاق ضمان کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

"لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ"

"جس کے لئے نفع ہے، اُسی پر اس کا ضمان ہے۔"

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید وفروخت کی بعض صورتوں سے منع فرمایا ہے، اُسی میں یہ بھی فرمایا کہ:

"وَلاَ رِبْحُ مَالَمْ يَضْمَنْ"

"اور ایسے مال کا نفع کمانا بھی جائز نہیں جس کا وہ ضامن نہیں۔"

اور یہ بات عقل وشرافت اور اِنصاف سے بھی بعید اور خود غرضی ہے کہ انسان اپنی کسی چیز کے منافع تو خود حاصل کرے اور اس کی مؤنت اور نقصان کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال دے۔ چنانچہ شریعت کے اس قاعدہ کلیہ پر اُمت کا اِجماع ہے۔ البتہ اس کی کچھ تفصیلات میں فقہائے کرام کا اِختلاف ہوا ہے، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

ملکیت اور ضمان کا فرق

تشریح اس قاعدے کی یہ ہے کہ ایک چیز ہے کسی مال کا کسی کی ملکیت میں ہونا، اور دوسری چیز ہے اُس مال کا کسی کے "ضمان" (Risk) میں ہونا۔ ضمان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مال تباہ یا ضائع ہوگیا تو یہ نقصان اُسی شخص پر پڑے گا جس کے ضمان (Risk) میں وہ مال تھا، کسی اور پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ہر مال سے متعلق دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک اُس کی ملکیت، دوسری اُس کا ضمان (Risk) یعنی اس کے نقصان کے خطرے کی ذمہ داری۔ بعض اوقات تو یہ دونوں چیزیں ایک ہی شخص کی ہوتی ہیں، یعنی مالک بھی وہی ہوتا ہے ضامن بھی وہی، مالک ہونے کا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اُسے حقوقِ ملکیت مل جاتے ہیں، وہ اُسے مالکانہ طور پر استعمال کرسکتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا اسے استعمال نہیں کرسکتا وغیرہ وغیرہ۔ اور ضامن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ مال ہلاک یا ضائع ہوجائے تو اس نقصان کی ذمہ داری کسی اور پر نہیں ہوتی، بلکہ یہ نقصان اُسے خود ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی چیز کا مالک تو ہوتا ہے، ضامن نہیں ہوتا، بلکہ ضامن کوئی اور ہوتا ہے۔ مالک ہونے کا فائدہ تو وہی ہوتا ہے جو اُوپر بیان ہوا، اور ضامن نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ

مال اگر ہلاک ہوجائے تو یہ نقصان اس پر نہیں پڑتا، بلکہ وہ مال جس شخص کے ضمان میں تھا اُسی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

کوئی چیز ضمان میں کب آتی ہے؟

جب ملکیت اور ضمان کا فرق واضح ہوگیا تو اب شریعت کے اس مسئلے کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب کسی مال کی فروخت کا عقد (Sale Contract) ہوجاتا ہے تو اس مال کی ملکیت تو اُسی وقت فروخت کرنے والے (بائع) کی طرف سے خریدار (مشتری) کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، مگر ضمان اُس وقت تک منتقل نہیں ہوتا جب تک وہ مال خریدار (مشتری-Buyer) کے قبضے میں یا اُس کے نمائندے کے قبضے میں نہ آجائے، یعنی ضمان صرف بیع (Sale Contract) سے منتقل نہیں ہوتا، بلکہ قبضے سے منتقل ہوتا ہے، قبضہ منتقل ہونے سے پہلے وہ حسب سابق بائع (Seller) کے ضمان میں رہتا ہے۔ اور خریدار کے قبضے میں آتے ہی وہ خریدار کے ضمان میں آجاتا ہے۔

مثلاً آپ نے کوئی گاڑی خریدی، جیسے ہی خریداری کا عقد (Sale Contract) مکمل ہوا اس کے مالک تو آپ اُسی وقت ہوگئے، مگر جب تک اُس پر آپ کو یا آپ کے کسی نمائندے کو قبضہ نہ مل جائے، وہ گاڑی آپ کے ضمان میں نہیں آئی بلکہ فروخت کرنے والے ہی کے ضمان میں ہے۔ چنانچہ اس حالت میں اگر وہ گاڑی کسی آفت سماوی سے تباہ ہوگئی، یا ڈاکو چھین کر لے گئے، تو یہ نقصان آپ پر نہیں پڑے گا کیونکہ گاڑی اُس وقت تک آپ کے ضمان میں نہیں آئی تھی، بلکہ فروخت کرنے والے پر پڑے گا کیونکہ گاڑی اُسی کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے اُسی کے ضمان میں تھی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ نے گاڑی کا جو سودا کیا تھا، وہ خود بخود ختم ہوجائے گا، اور اُس گاڑی کی قیمت ادا کرنے کے آپ ذمہ دار نہیں رہیں گے۔ اور اگر وہ گاڑی آپ کے قبضے میں آنے کے بعد ہلاک ہوئی ہے تو یہ نقصان آپ پر پڑے گا۔

مذکورہ خصوصیت کی مزید تفصیل

جب یہ بات بھی واضح ہوگئی تو اَب اُس خصوصیت کی کچھ مزید تفصیل بیان کرتا ہوں جو اُوپر عنوان میں آئی ہے کہ ''جو مال آپ کے ضمان میں نہیں اُس سے نفع کمانا بھی آپ کو جائز نہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو فقہی اصول ہے کہ خریدی ہوئی چیز کو وصول کرنے (قبضے میں لینے) سے پہلے اُسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں، اُس کی ایک بڑی وجہ یہی قاعدہ ہے جو یہاں بیان ہورہا ہے، کیونکہ خریدی ہوئی چیز کو اپنے قبضے میں لینے سے پہلے اگر آپ اُسے آگے فروخت کریں گے تو اس فروخت سے حاصل ہونے والا نفع ایسی چیز کا نفع ہوگا جو آپ کے ضمان میں نہیں تھی، حالانکہ جو چیز آپ کے ضمان میں نہیں اس کا نفع لینا جائز نہیں۔

اس حکیمانہ اُصول کے ذریعے مہنگائی کے ایک چور دروازے کو بھی شریعت نے بند کیا ہے جس کی تفصیل وہاں اُس مسئلے کے ضمن میں آچکی ہے۔

پھر یہ قاعدہ صرف خرید وفروخت ہی سے متعلق نہیں، بلکہ شریعت میں جہاں بھی کسی مملوک شی سے اِنتفاع کی اجازت ہے اسی قید کے ساتھ ہے کہ اس کے نقصان ومؤونت کی ذمہ داری ادا کرے۔

مثلاً مشارکت کا معاملہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ہر شریک نفع ونقصان دونوں میں شریک ہو، اگر کوئی شریک صرف نفع میں شریک ہو، نقصان میں شریک نہ ہو تو یہ معاملہ ناجائز ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر مضابت میں اگر ربُّ المال صرف نفع میں شریک ہو، نقصان کی ذمہ داری نہ لے تو یہ مضاربت ناجائز ہے۔

اسی طرح کسی کو ودیعت (امانت کے طور پر لی ہوئی کسی چیز) سے اِنتفاع اور اُسے اپنے استعمال میں لانا اسی لئے ناجائز ہے کہ وہ اُس کے ضمان میں نہیں ہوتی، لیکن جب مالک سے اجازت لے کر اُسے استعمال کرے گا تو نقصان کا ضامن بھی ہوگا۔

اسی طرح سود کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں قرض دیئے ہوئے اُس مال کا نفع (Interest) لیا جاتا ہے جو قرض دینے والے کے ضمان میں نہیں، چنانچہ اگر وہ مال قرض لینے والے کے پاس ہلاک یا ضائع ہو جائے تو ضمان قرض دینے والے پر نہیں آتا۔

﴿2﴾ ''غَرَر'' (مبہم اور غیر یقینی سودوں) کی ممانعت:

اسلامی معیشت کی ایک اور بنیادی خصوصیت جو دوسرے معاشی نظاموں سے اسے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ایسے تمام سودوں اور معاملات (''عقود''، Agreements/Contracts) کو ناجائز قرار دیا گیا ہے جن میں ''غَرَر'' پایا جاتا ہو۔

''غَرَر'' عربی لفظ ہے، اس کے ایک لغوی معنیٰ دھوکے کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں ''غَرَر'' کی حقیقت جو فقہی مسائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ''غَرَر'' کی دو صورتیں ہیں:

''غَرَر'' کی دو صورتیں

۱۔ ایک یہ کہ کسی معاملے (عقد) میں ایسا ابہام ہو کہ اس کی وجہ سے عموماً فریقین کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہوں (یا کسی ایک فریق کو اس نزاع کے جھمیلے سے بچنے کے لئے اپنے نقصان پر مجبوراً صبر کرنا پڑتا ہو) ایسے ابہام کو فقہی اِصطلاح میں ''جَہالَت'' کہا جاتا ہے۔ یہ ابہام یا جہالت بیع (Sale) میں ہو یا اِجارے (Employment/ Lese) میں ''غَرَر'' ہے اور ناجائز ہے۔

یہ ابہام یا جہالت تین طرح سے ہو سکتی ہے:

ایک یہ کہ خریدی گئی چیز (مَبِیع) کی ذات، یا نوعیت، یا مقدار نامعلوم یعنی مجہول ہو (جس کی مثال آگے آئے گی)۔

دوسری یہ کہ خریدی گئی چیز کا عوض (''ثمن'' Price) مجہول ہو۔

تیسری یہ اگر سودا (''عقد'' Contract) اُدھار کا ہوا ہے تو اس اُدھار کی ادائیگی کی مدّت معلوم اور متعین نہ ہو، مجہول ہو۔

"غَرَر" کی دوسری صورت

۲۔"غَرَر" کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی معاملہ(''عقد'' Contract) غیر یقینی اور مشکوک ہو، یعنی یہ معلوم نہ ہو کہ وہ حتمی صورت اختیار کر پائے گا یا نہیں، یعنی باقی رہے گا یا ختم ہو جائے گا۔

غیر یقینی اور مشکوک ہونے میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ فریقین نے ایک دوسرے سے جو چیز (مثلاً مبیع یا ثمن) لینے کا سودا کیا ہے، وہ چیز ملے گی بھی یا نہیں؟

خلاصہ یہ کہ ہر وہ عقد جس میں مذکورہ بالا قسم کا ابہام (جہالت) ہو، یا وہ مذکورہ بالا حد تک غیر یقینی اور مشکوک ہو، اسلامی تعلیمات کی رُو سے ناجائز ہے۔

تجارت اور باہمی لین دین میں ''غَـــرَر'' کے مختلف معاملات (عقود) زمانۂ جاہلیت سے چلے آرہے تھے جن کی ممانعت قرآن وسنت نے صریح طور پر الگ الگ بیان کی ہے، مثلاً قمار (جُوا) کہ اُس کی حرمت ومذمت قرآنِ حکیم نے سخت الفاظ میں تاکید سے فرمائی ہے جیسا کہ اسی مقالے میں خصوصیت نمبر ۵ میں تفصیل سے آچکا ہے، قمار کے حرام ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں شدید قسم کا ''غَرَر'' پایا جاتا ہے جو عداوتوں اور دُشمنیوں کو جنم دیتا ہے۔

اور مثلاً بَیعُ المُلا مَسة، بَیعُ المُنابَذة، بَیعُ الحَصاة ، بَیعُ حَبَلِ الحَبلَة، ،اور بَیعُ المَبِیع قبل القبض"
وغیرہ، کہ غرر کی وجہ سے احادیثِ نبویہ میں ان کی صریح ممانعت آئی ہے (کتب حدیث وفقہ میں ان کی تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں) پھر آنحضرت ﷺ نے ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر بھی "غــرر" کی ممانعت اس طرح فرمادی ہے کہ اس ممانعت میں "غــرر" والے وہ سارے معاملات (عقود) بھی آگئے جو پہلے سے رائج تھے، اور ایسے تمام عقود بھی جو آئندہ قیامت تک پیدا ہوں یا ایجاد کئے جائیں، چنانچہ صحیح مسلم اور دوسری کتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان سندِ صحیح کے ساتھ آیا ہے کہ:

"نهٰى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغَرَر"

ترجمہ:۔''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کنکر کی بیع (Sale)'' سے منع فرمایا ہے، اور غَرَر کی بیع (Sale) سے بھی۔''

''کنکر کی بیع'' کے دو طریقے رائج تھے، ایک یہ کہ بائع یعنی فروخت کرنے والے کے پاس مختلف قسم کی چیزیں مثلاً کپڑے وغیرہ ہیں، وہ خریدار سے کہتا ہے کہ تم ان پر کنکر پھینکو، جس چیز یا کپڑے کو وہ لگ جائے وہ اتنے (مثلاً ۵ روپے) میں تمہارے ہاتھ فروخت کیا، زمانۂ جاہلیت میں جب یہ بیع کر لی جائے تو جائز بیع کی طرح یہ بھی لازم سمجھی جاتی تھی، یعنی خرید وفروخت کرنے والوں میں سے کسی کو اسے ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا تھا، خواہ وہ کنکر ایک روپے کی چیز پر گری ہو یا سو روپے کی چیز پر، نیز خواہ وہ کتنی ہی عیب دار ہو یا بالکل ٹھیک حالت میں ہو۔

"بیــع الـحـصـاة (کنکر کی بیع) کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو یہ کہہ کر فروخت (Sale) کرتا تھا کہ تم

یہاں سے کنکر پھینکو جہاں جا کر یہ گرے گا، وہاں تک کی زمین میں نے تمہارے ہاتھ (مثلاً) ایک ہزار روپے میں فروخت کی۔

ان دونوں طریقوں میں خریدی گئی چیز کا عوض یعنی ''ثمن'' (مثلاً پہلی صورت میں ۵ روپے اور دوسری صورت میں ایک ہزار روپے) تو متعین اور معلوم ہے، یعنی اس میں کوئی ابہام نہیں، مگر مَبِیع کے مقابلے میں جو چیز خریدار کو مل رہی ہے وہ بالکل مُبہم، غیر متعین اور مجہول ہے، اس میں کسی ایک فریق کو تو بڑا نفع مل سکتا ہے اور دوسرے فریق کو بہت بڑا نقصان ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، خصوصاً جبکہ یہ سودا لاکھوں کروڑوں روپے کی اشیاء میں ہو، ظاہر ہے اس کے نتیجے میں عداوتیں، دُشمنیاں اور نزاعات پیدا ہوں گے، چنانچہ یہ بیع بھی ''بَیْعُ الْغَرَر'' میں داخل اور شرعاً ناجائز ہے۔

یہ تشریح تو مذکورہ بالا حدیث شریف کے پہلے جملے (کنکر کی بیع) سے متعلق ہوئی، اس میں ''غَرَر'' کی پہلی صورت یعنی ابہام (جہالت) کی دو مثالیں سامنے آئی ہیں۔

اس حدیث کے دوسرے جملے ''وعَنْ بَیْعِ الْغَرَر'' (غَرَر کی بیع) میں قاعدۂ کلیہ کے طور پر ''غَرَر'' کی دونوں صورتوں کی ممانعت آ گئی ہے، یعنی ایسے تمام معاملات (عقود) کی بھی جن میں ابہام (جہالت) ہو، اور ایسے تمام معاملات کی بھی جو غیر یقینی اور مشکوک ہوں۔

''غیر یقینی اور مشکوک'' ہونے میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل تین طرح کے عقود (سودے، معاملات) آتے ہیں:

۱۔ ایسی چیز کو فروخت کی جائے جو فروخت کرنے والا، خریدار کو فی الحال سپرد کرنے پر قادر نہیں، مثلاً پرندہ جو ہوا میں اُڑتا رہا ہو، یا مچھلی جو ایسے پانی میں ہو جو بائع (فروخت کرنے والے) کی ملکیت میں نہیں، یا مثلاً جانور کا بچہ جو ابھی حمل کی صورت میں ماں کے پیٹ میں ہو۔

۲۔ سودے (''عقد'' Contract) کو ایسی شرط کے ساتھ مشروط (معلق) کیا گیا ہو کہ پتہ نہیں وہ شرط پائی بھی جائے گی یا نہیں؟ مثلاً کسی کا موبائل گم ہو گیا اُسے اُمید ہے کہ مل جائے گا مگر یقین نہیں، وہ اسی حالت میں موبائل کو کسی کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے کہ اگر وہ مل گیا تو تمہارے ہاتھ (مثلاً) ایک ہزار روپے میں فروخت کیا، یا مثلاً کسی نے اپنی گاڑی اس شرط کے ساتھ فروخت کی کہ اگر کل بارش ہو گئی تو یہ میں نے تمہارے ہاتھ دس لاکھ روپے میں فروخت کی، ظاہر ہے کہ یہ صرف وعدہ نہیں بلکہ سودا (''عقد'' Contract) ہے، اگر صرف وعدہ ہوتا، یعنی فروخت کرنے والا یہ کہتا کہ: ''اگر کل بارش ہو گئی تو یہ گاڑی میں دس لاکھ روپے میں تمہارے ہاتھ فروخت کر دوں گا'' تو اس میں کوئی خرابی نہیں تھی، ایسا وعدہ کر لینا جائز ہے، اور یہ ''غرر'' میں داخل نہیں، لیکن جو مثال ہم نے اُوپر لکھی ہے اس میں الفاظ وعدے کے نہیں، یعنی اس میں ''فروخت'' کر دوں گا'' کے الفاظ نہیں، بلکہ ''فروخت کی'' کے الفاظ ہیں جو ''عقدِ بیع (Sale contract) ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کل بارش ہو گئی تو کسی نئے عقد یا سودے کی ضرورت نہیں ہو گی، آج کا کیا ہوا یہی عقد برقرار رہے گا اور مؤثر ہو جائے گا، اور اگر کل بارش نہ ہوئی تو یہ سودا (عقد) خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اور اُوپر

آچکا ہے کہ کسی سودے کو ایسی شرط کے ساتھ مشروط کر دینا "غَرَر" میں داخل ہے، جائز نہیں، کیونکہ پتہ نہیں کل بارش ہوگی یا نہیں؟

۳۔ کسی چیز کی فروخت کو مستقبل کی طرف منسوب کیا جائے، یعنی کسی چیز کو فی الحال نہیں بلکہ اگلے زمانے سے آج فروخت کیا جائے، مثلاً دسمبر کے مہینے میں کوئی شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ میں نے اپنی یہ گاڑی تمہارے ہاتھ یکم فروری سے دس لاکھ روپے میں فروخت کی، اور دوسرا اسے قبول کر لیتا ہے تو یہ سودا جائز نہیں، کیونکہ مستقبل کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس میں "غَـــرَر" ہے ناجائز ہے، اور اس میں "غَـــرَر" ہونے کی وجہ سے اس سودے کا غیر یقینی اور مشکوک ہونا ہے، کیونکہ پتہ نہیں یکم فروری تک یہ گاڑی موجود بھی رہے گی یا نہیں؟ اور موجود رہی تو اس کی خریدار کو سپردگی ممکن بھی ہوگی یا نہیں؟

"غَـــــــــرَر" کے بہت سے طریقے زمانہ جاہلیت (اسلام سے پہلے) سے چلے آرہے ہیں، قمار (جوے) اور سٹے (Speculation) کے جتنے معاملات رائج تھے، یا ہیں، وہ سب اس لئے بھی ناجائز ہیں کہ ان میں "غَرَر" پایا جاتا ہے۔ اور موجودہ دور تو نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) کا دور ہے، اس میں غرر کے اتنے طریقے رائج ہوگئے ہیں کہ شمار کرنا بھی آسان نہیں، یہاں چند مثالیں درج کرتا ہوں کہ یہ معاملات بھی غرر میں آتے ہیں، اور شرعاً ناجائز ہیں۔

موجودہ زمانے میں "غَرَر" کی چند مثالیں

۱۔ "شارٹ سیل" (Short Sale)

یعنی بائع (فروخت کرنے والا) ایسی چیز فروخت کرتا ہے جو اُس کی ملکیت میں نہیں، لیکن اُسے یہ اُمید ہوتی ہے کہ سودا (Sale Contract) ہوجانے کے بعد وہ اُسے بازار سے خرید کر دے دے گا۔

آج کل یہ بیع (Sale) کثرت سے رائج ہے، یہ اجناس اور اَشیاء میں بھی ہوتی ہے، اور شیئرز (Shares "حصص") کے کاروبار میں بھی، اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اس میں "غَـــرَر" یعنی غیر یقینی اور مشکوک صورتِ حال ہے کہ پتہ نہیں مبیع (Subject Matter) یعنی فروخت کی جانے والی چیز بائع (Seller) کی ملکیت میں آئے گی بھی یا نہیں؟

۲۔ "غیر مقبوض کی بیع"

اسی سے ملتی جلتی "غیر مقبوض کی بیع" ہے، جسے فقہی اصطلاح میں "بیع قبل القبض" کہا جاتا ہے، یعنی ایسی چیز فروخت کرنا جو بائع (Seller) کی ملکیت میں تو آگئی ہے، مگر اُس کے قبضے (Possession) میں نہیں آئی، اس میں بھی "غَـــرَر" پایا جاتا ہے، اور ناجائز ہے، کیونکہ پتہ نہیں وہ چیز بائع کے قبضے میں آئے گی بھی یا نہیں؟ اور یہ عقد باقی بھی رہے گا یا نہیں؟

مثلاً "الف" سے "ب" نے کار خریدی، یعنی عقدِ بیع (Sale Contract) مکمل ہوگیا، جس کی وجہ سے گاڑی کی ملکیت "الف" سے "ب" کی طرف منتقل ہوگئی، مگر ابھی وہ گاڑی "الف" نے "ب" کے سپرد کی تھی نہ "ب" کے کسی نمائندے کی سپردگی

(قبضے) میں دی تھی، اسی حالت میں "ب" نے وہ گاڑی "ج" کے ہاتھ فروخت کردی، یہ "بیع المبیع قبل القبض" ہوئی، اور ناجائز ہے، کیونکہ اس بیع کی حالت غیر یقینی اور مشکوک ہے، جو "غَرَر" میں داخل ہے۔

غیر یقینی اور مشکوک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ گاڑی "الف" کے پاس ہی کسی وجہ سے تباہ ہوجائے، اور اگر ایسا ہوا تو "الف" اور "ب" کے درمیان جو عقدِ بیع (Sale Contract) ہوا تھا وہ فسخ (ختم) ہوجائے گا، اور اس کے ختم ہونے کی وجہ سے بعد میں ہونے والا وہ عقد بھی خود بخود ختم ہوجائے گا جو "ب" نے "ج" کے ساتھ اس گاڑی کا کیا تھا۔

اسلامی معیشت کی پچھلی خصوصیت میں بھی بیع قبل القبض کی ممانعت کا ذکر آیا ہے، وہاں اس کی ایک اور خرابی کا بیان تفصیل سے ہوا ہے، وہ یہ کہ بیع "ربح مالم یضمن" کا ذریعہ بنتی ہے، یعنی اس کے ذریعے بائع ایسی چیز کا نفع حاصل کرتا ہے جو اس کے ضمان (RISK) میں نہیں، حالانکہ یہ کھلی ناانصافی ہے کہ کسی چیز کا نفع تو آدمی خود حاصل کرے اور اس کے نقصان کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال دے۔ اس ناانصافی کی ممانعت کے بارے میں بھی آنحضرت ﷺ کی احادیث وہاں بیان ہوئی ہیں، دوبارہ دیکھ لی جائیں۔

خلاصہ یہ کہ "بیع قبل القبض" میں شرعاً دو بڑی خرابیاں ہیں:

(۱) ایک ایسی چیز کا نفع حاصل کرنا جو بائع (Seller) کے ضمان (Risk) میں نہیں۔

(۲) دوسری یہ کہ اس میں "غَرَر" ہے، جیسا کہ اُوپر بیان ہوا۔

غور کیا جائے تو یہی دونوں خرابیاں شارٹ سیل (Short Sale) میں بھی پائی جاتی ہیں، بلکہ زیادہ قوت کے ساتھ پائی جاتی ہیں، کیونکہ اُس میں تو آدمی ایسی چیز کا نفع حاصل کرتا ہے جو اُس کی نہ ملکیت میں ہے، نہ ضمان میں، اور "غَرَر" کا پایا جانا بھی اس میں زیادہ واضح ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا یہ دونوں قسم کے سودے سٹہ (Speculation) کا ذریعہ بنتے ہیں، اور آج کل تو بڑے پیمانے پر ذریعہ بنے ہوئے ہیں، کیونکہ سٹہ کھیلنے والے، چیز کو وصول کرنے کے اِرادے سے نہیں خریدتے، اس کی دِلچسپی صرف اس کی قیمت کے اُتار چڑھاؤ میں ہوتی ہے، وہ اُس چیز کے پے در پے کئی سودے کرنے کے بعد ایک دوسرے سے صرف فرق (Difference) کی ادائیگی یا وصولی کرلیتے ہیں، یعنی لینا دینا اُس خریدی ہوئی چیز کا نہیں ہوتا، بلکہ مقصود اس کی قیمت کے فرق کا لینا دینا ہوتا ہے، اور اُس چیز کی خرید وفروخت صرف مصنوعی طور پر ہوتی ہے، اسی وجہ سے یہ سارا کاروبار، تجارت کے بجائے سٹہ اور جُوا (قمار) بن کر رہ جاتا ہے، جو بسا اوقات تجارتی بحرانوں (Crises) کا سبب بنتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی ممانعت اپنے اس حکم کے ذریعے بھی فرمائی ہے کہ:

"لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ"

ترجمہ:۔ "ایسی چیز فروخت نہ کرو جو تمہارے پاس نہیں" (یعنی تمہاری ملکیت اور قبضے میں نہیں ہے)۔

اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جلیل القدر صحابۂ کرام یعنی حضرت حکیم بن حزام اور حضرت عبداللہ بن

عمرو (رضی اللہ عنہما) نے روایت کیا ہے۔

البتہ دو قسم کے عقد (سودے) اس ممانعت سے مستثنیٰ ہیں:

(۱) ''عقدِ سَلَم'' (۲) ''عقدِ استصناع'' کہ ان میں بھی بیع غیر مملوک اور غیر مقبوض اجناس واشیاء کی ہوتی ہے، لیکن شرعاً جائز ہیں، جن کی تفصیل حدیث اور فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے، ان کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے عقود کو ایسی شرطوں اور قیدوں کا پابند کردیا گیا ہے کہ اُن کی موجودگی میں ایسا ''غَرَر'' باقی نہیں رہتا جو فریقین کے درمیان نزاعات کا باعث بنتا ہو، اور معاشی سرگرمیوں کو غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار کرتا ہو۔ اُن شرائط اور قیود کے بغیر یہ سودے (عقود) بھی شرعاً جائز نہیں ہوتے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے کتبِ فقہ کی مراجعت کی جائے۔

۳۔ قرضوں اور دُیون کی بیع (Sale of Debts)

''غَـــرَر'' والے سودوں ہی کی ایک قسم ''قرضوں اور دُیون کی بیع'' ہے، جو آج کل بہت بڑے پیمانے پر رائج ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ''الف'' کا قرضہ کچھ لوگوں کے ذمہ واجب الاداء ہے۔ ''الف'' یہ قرضہ ''ب'' کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے، ''ب'' یہ قرضہ اس اُمید پر خریدتا ہے کہ اُسے یہ قرض داروں سے وصول ہوجائے گا، لیکن یہ بات یقینی نہیں، کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ وہ سب، یا ان میں سے بعض نادہندہ (Defaulter) ہوجائیں، یعنی اپنے ذمہ کا قرض اداء نہ کریں، یا نہ کرسکیں، اگر ایسا ہوا تو ''ب'' اپنی اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے گا جو اُس نے ''الف'' کو اَداء کی ہے، لہٰذا مشکوک اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے قرضوں اور دُیون کی بیع (Sale of Debts) بھی ''غَرَر'' میں داخل ہے، اور ناجائز ہے۔

اس عقد کے ناجائز ہونے کی ایک دوسری وجہ بھی بہت بڑی ہے، وہ یہ کہ قرض اور دَین کو خریدنے والا قابلِ وصول رقم میں کٹوتی (Desconting) کرکے خریدتا ہے، یعنی جس قرض کو وہ خریدتا ہے وہ زیادہ ہوتا ہے، اور جس رقم کے بدلے خریدتا ہے وہ کم ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی بیس ملین روپے کو اُنیس ملین روپے میں خریدے، ظاہر ہے کہ یہ رِبا اور سود ہے، جس کی حرمت کا بیان اس مقالے میں تفصیل سے اور بار بار آچکا ہے

حالیہ معاشی بحران!

پچھلے تقریباً دو سال سے تقریباً پوری دُنیا معاشی اور مالیاتی بحران (Financial Crises) کا شکار ہے، جس میں بڑے بڑے عالمی بنک دیوالیہ (Bankrupt) ہوگئے، برسوں سے خوب نفع کماتی ہوئی عالمی شہرت والی بڑی بڑی کمپنیاں اچانک بھاری نقصان کا خوفناک جھٹکا لے کر ڈھیر ہوگئیں، باقی بچنے والی کمپنیوں کے حصص (shares) کی قیمتیں اتنی گر گئیں کہ مالکانِ حصص دیکھتے ہی دیکھتے اپنی دولت کے بڑے حصے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس بحران کا آغاز تو امریکہ سے ہوا، لیکن اس کے تباہ کن اثرات سے آج پوری دنیا دوچار ہے، اور ہر ملک کو تجارتی اور معاشی

مشکلات کا سامنا ہے، اس کا بہت بڑا سبب یہی قرضوں اور دُیون کی بیع (sale of debts) ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں نے سودی قرضوں پر مکانات خریدے ہوئے تھے، جن کی وہ قسطیں اداء کر رہے تھے، جن مالیاتی اداروں سے انہوں نے یہ قرضے لئے تھے ان اداروں نے جلد نفع کمانے کی ہوس میں یہ قرضے دوسرے بڑے مالیاتی اداروں کے ہاتھ نسبتہً کم قیمت فروخت کر دیئے، یعنی یہ قرضے سود سمیت جتنی رقم کے تھے اُس سے کچھ کم قیمت پر فروخت کر دیئے، جس کا حاصل درحقیقت یہ ہوا کہ سود میں سے کچھ کمی کر دی، نہ کہ اصل قرضے میں سے، تاکہ وہ حاصل شدہ قیمت سے مزید سودی قرضے جاری کر سکیں، اور خریدنے والے مالیاتی ادارے ان قرضوں کو کٹوتی (Disconting) کے لالچ میں خریدتے چلے گئے، پھر انہوں نے بھی جلد نفع کمانے کے شوق میں یہ قرضے دوسرے بڑے عالمی مالیاتی اِداروں کے ہاتھ نسبتہً کم قیمت میں فروخت کر دیئے، اس طرح ان قرضوں کی بیع در بیع ہوتی رہی، اور ہر خریدنے والا اِدارہ کچھ نفع (Discount) کما کر اِن قرضوں کی نادہندگی (Default) کا خطرہ دوسرے اِداروں کی طرف منتقل کرتا چلا گیا یہاں تک کہ ان قرضوں کی مالی دستاویزات بنا کر انہیں ملک اور بیرونِ ملک بھی وسیع پیمانے پر بیچا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اُن مکانات کی قیمتیں گریں جن کے قرضوں سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا، تو خریدنے والوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ مزید قسطیں اداء کرتے رہے تو مکانات کی جو کُل لاگت ان پر آئے گی وہ ان کی موجودہ بازاری قیمت سے بہت زیادہ ہوگی، لہٰذا انہوں نے اِن قرضوں کی ادائیگی روک دی، اس نادہندگی (Default) کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اِداروں نے وہ مکانات ضبط کر لئے، مگر ضبط کئے ہوئے مکانات کی قیمتیں چونکہ گر چکی تھیں لہٰذا وہ قیمتیں قرضوں کی ادائیگی کے لئے ناکافی ہوگئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اربوں ڈالر کے یہ قرضے خریدے ہوئے تھے، ان کو اِحساس ہوا کہ قرض کی بنیاد پر کھڑے مالیاتی اثاثے ان کے تصوّر کے برعکس بالکل غیر محفوظ اور غیر یقینی ہیں، اس سے ہر طرف خوف وہراس پھیل گیا، اور قرض کی بنیاد پر قائم مالیاتی اِداروں اور بنکوں نے خوف زدہ ہو کر نئے قرضوں کا اِجراء روک دیا، جس کی وجہ سے قرض کی بنیاد پر چلنے والی کمپنیوں کو نقصان ہونے لگا، اور حصص (شیئرز) کی قیمتیں تیزی سے نیچے آگریں، جن لوگوں نے کروڑوں، اربوں روپے شیئرز (حصص) کے سٹہ میں لگا کر خطرہ مول لیا تھا، وہ مالی طور پر بدحالی کا شکار ہوگئے، اور اس ساری صورتِ حال کا نتیجہ موجودہ عالمی معاشی بحران کی صورت میں ظاہر ہوا، جس کے بارے میں اندازہ کیا جارہا ہے کہ اس نے پوری دُنیا کی تقریباً ۴۵ فیصد دولت کا صفایا کر دیا ہے۔

یہ اس عالمی معاشی بحران کے صرف ایک پہلو کا بہت مختصر سا حال ہے، اس کی عبرت ناک داستان کے لئے اُس لٹریچر کا مطالعہ مفید ہوگا جو عالمی زبانوں میں اس دوران وجود میں آیا ہے، خصوصاً برادرِ عزیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ قابلِ دید ہے جو انہوں نے اسی موضوع پر لکھا ہے، اور سوئٹزرلینڈ کے ورلڈ اکنامک فورم (World Economic Forum) کے سالانہ اجلاس (منعقدہ جنوری ۲۰۱۰ء) میں پیش کیا تھا، یہ اِدارہ اس وقت معیشت کے معاملات میں دُنیا کا سب سے بڑا باوقار فکری اِدارہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کے اس سالانہ اجلاس کا بنیادی موضوع یہی موجودہ ''عالمی معاشی بحران'' تھا۔ موصوف کا اصل مقالہ انگریزی میں ہے، اُردو

ترجمہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ وللہ الحمد وجزاہ اللہ خیر الجزاء.

اس باب کا خلاصہ :۔

پچھلے اسلامی معیشت کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) معاشی سرگرمیاں اسلام کی نظر میں دین سے الگ نہیں، دین ہی کا ایک اہم حصہ ہیں، ہر معاشی عمل جو حسن نیت کے ساتھ ہو، اور شرعی حدود میں ہو، اسلام کی نظر میں عبادت کا درجہ پالیتا ہے، معاشی ترقی اس کی نظر میں پسندیدہ اور کسب حلال ایک درجہ میں فرض ہے۔

(۲) لیکن مسئلہ معاش کو اسلامی زندگی کا اصل مسئلہ اور فکر وعمل کا محور قرار نہیں دیتا، اور نہ معاشی ترقی اس کے نزدیک انسان کا منتہائے مقصود ہے، اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی اور آخرت کی مکمل کامیابی ہے، لیکن چونکہ اس منزل مقصود کو دنیا کی زندگی سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا اس لئے وہ تمام سرگرمیاں بھی ضروری ہو جاتی ہیں جو دنیا کی امن و پرسکون زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔

(۳) سب عاقل بالغ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں، خواہ امیر ہوں، یا غریب، حاکم ہوں یا محکوم، اجیر (Labour) ہوں یا مستأجر (Enterprnecur)، سب کو آخرت میں برپا ہونے والے یوم حساب میں اپنے ہر اچھے برے اور چھوٹے بڑے عمل کا حساب دینا ہے، مال کس کس طرح کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا؟ اس کا بھی حساب دینا ہے، اور ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پانی ہے۔

(۴) اسلامی نظام معیشت میں وسائل معاش پر حکومت، جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کی اجارہ داری نہیں ہوتی، ہر شخص کو اپنی صلاحیت، محنت اور سرمایہ کے تناسب سے اس کا معقول صلہ حاصل کرنے کے کھلے مواقع میسر ہوتے ہیں۔

(۵) اسلام کی معاشی تعلیمات نے ارتکاز دولت کے سب دروازے بند کر دیے ہیں تاکہ دولت کا ذخیرہ چند خاندانوں یا معاشرے کے خاص خاص طبقات میں سمٹنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے اور امیر وغریب کا تفاوت فطری اور قابل عمل حد تک کم کیا جائے۔

(۶) طلب ورسد (Demand and Supply) کی آزادی کا تحفظ کیا گیا ہے، تاکہ اشیائے صرف اور اشیائے ضرورت کی مصنوعی قلت پیدا نہ کی جا سکے، اور ان کی قیمتیں من مانے اور مصنوعی طریقوں سے نہ بڑھائی جا سکیں۔

ارتکاز دولت کی بیخ کنی اور "طلب ورسد" کے تحفظ میں جو تفصیلات پیچھے آئی ہیں، ان سے ایک بات نمایاں طور پر یہ سامنے آتی ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات میں تنخواہیں اور اجرتیں بڑھانے سے زیادہ زور اس حکیمانہ اصول پر دیا گیا ہے کہ اشیائے ضرورت اور اشیائے صرف لوگوں کو آسانی اور فراوانی سے مناسب حد تک سستی مل سکیں، وہ ایک عام آدمی کی دسترس سے باہر نہ ہوں، رہیں تنخواہیں

اور اجرتیں تو ان کا تعین طلب و رسد کے قدرتی نظام کے تحت اور اشیاء کی بازاری قیمتوں کے سامنے رکھ کر ہر شخص اپنے لئے خود کرتا ہے، یعنی روزگار کے مواقع کی آزادی اور فراوانی کے باعث وہ یہ فیصلہ آزادانہ طور پر خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض اور ذمہ داریاں اس نے اپنے ذمہ لی ہیں، اشیائے صرف کی قیمتوں کے پیش نظر، ان کا کتنا معاوضہ اس کے لئے کافی ہے؟ اس سے کم ملے تو یہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش اختیار کر لے گا، اور زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا کسی اور کو تلاش کر لے گا۔ ہر شخص اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق یا ضرورت مند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ جب اشیائے صرف کی قیمتیں مناسب حد تک کم ہوں گی تو اجرتیں اور تنخواہیں بھی مناسب حد تک کم ہو جائیں گی۔ پیداوری لاگت کم ہوگی اور ایک متوازن معیشت وجود میں آئے گی۔

(۷) اسلامی معیشت کی خصوصیات میں جگہ جگہ یہ بات سامنے آتی ہے، اور خصوصاً ہماری ذکر کردہ پہلی خصوصیت نے اسے اور کھول دیا ہے کہ نظام سرمایہ داری کے برعکس اسلامی تعلیمات نے معیشت میں کسی بھی موقع پر، کسی بھی خاص طبقے کو نوازنے کے لئے کسی دوسرے طبقے کو دبانے سے مکمل پرہیز کیا ہے، اور تمام بنی نوع انسان کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنے کا نہایت باریک بینی سے اہتمام کیا ہے۔

(۸) اسلام نے ''غرر'' یعنی مبہم اور غیر یقینی سودوں کی ممانعت کر کے جہاں بازار اور تجارت و معیشت کو محفوظ اور فطری طور پر رواں دواں رکھنے کے لئے مالیاتی بحرانوں (Financial Crises) کا راستہ سختی سے روکا ہے، وہیں ایسے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے ہیں جن سے تجارتی نزاعات پیدا ہوتے، اور باہمی دشمنیاں جنم لیتی ہیں۔

آج کل نزاعات اور عداوتوں کا سیلاب، جہاں معاشرے کے امن و امان کو تباہ، اور معاشی سرگرمیوں کو قدم قدم پر مفلوج کر رہا ہے، وہیں عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار نے حق و انصاف کا حصول انتہائی مشکل بنا دیا ہے، ہر سطح کی عدالتوں کی تعداد جتنی بھی بڑھائی جاتی ہیں، وہ مقدمات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار کے سامنے ناکافی ہو جاتی ہے۔ اور اب حالت یہاں تک پہنچ ہے کہ لوگ برسوں تک وکیلوں اور عدالتوں کے چکر لگانے کے بجائے اپنی مظلومیت ہی پر صبر کر بیٹھنے میں عافیت سمجھنے لگے ہیں۔

اگر اسلامی معیشت کی مذکورہ بالا خصوصیات کو تعصبات کے بجائے انصاف سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ ایسی ممتاز خصوصیات ہیں جن سے دوسرے نظام ہائے معیشت محروم چلے آرہے ہیں۔

اگر دنیا کے لئے پھر معاشی توازن، بازاروں کی فطری آزادی، عدل و انصاف اور پرسکون زندگی مقدر میں ہے تو وہ صرف اسلام ہی کے دامن رحمت میں ملے گی۔

مژدہ کی ہو کہ فرنگی ہوسِ خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق